ترجمہ: محمد حنیف ندوی

علامہ ابن حزم اندلسی کا ایک مکتوب

شارعِ نجات کے بارے میں

حمد و صلوٰۃ کے بعد۔ تمہارا مکتوب ملا۔ اس میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ اس وقت لوگ دو گروہوں میں منقسم ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جس نے علوم اوائل کی پیروی کی ہے اور ان علوم سے بہرہ مند حضرات کی اطاعت اختیار کی ہے۔ دوسرے گروہ نے علومِ نبوت کو مشعل راہ ٹھہرایا ہے۔ تم یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ ان دونوں میں برسرِ حق کون ہے۔ تمہاری یہ خواہش بھی ہے کہ یہ جواب نہایت مختصر ہو تاکہ ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہ سکے۔ یعنی ایسا طویل نہ ہو کہ اس کا آخری حصہ پہلے حصے کو بھلا دینے کا سبب بنے۔ نیز اس اختصار کے ساتھ ساتھ ایسا واضح ہونا چاہیے کہ جسے ہر پڑھنے والا آسانی سے سمجھ سکے۔ پھر اسے مدلل بھی ہونا چاہیے تاکہ اس کی صحت و استواری کا اندازہ لگایا جا سکے۔ میں تائیدِ ایزدی سے اس کا بسرعت تمام جواب دے رہا ہوں، اس لیے کہ شرعاً لوگوں کو ہلاکت سے بچانے کے لیے نصیحت اور کوشش ضروری ہے۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے (اللہ تعالیٰ تمہیں اور ہمیں اپنی رضا سے بہرہ مند ہونے کی توفیق عطا فرمائے) کہ علوم اوائل متعدد علوم کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس میں فلسفہ اور منطق کی تعریفات شامل ہیں۔ جن کے بارے میں افلاطون، اس کے شاگرد ارسطو، اسکندر اور اسی انداز کے کچھ اور لوگوں نے بحث اور گفتگو کی طرح ڈالی ہے۔ یہ عمدہ اور اونچا علم ہے۔ اس لیے کہ اس میں پورے عالم کو جاننے کی تگ و دو پنہاں ہے اور اس بات کی تفصیل درج ہے کہ جنس کیا ہے؟ نوع کسے کہتے ہیں؟ اشخاص کیا ہیں اور جوہر و عرض کی تقسیم کن معنوں میں ہے؟ جہاں تک منطق کا تعلق ہے اس میں دلیل و برہان سے انسان کو واقف ہونے کا موقع ملتا ہے جس کے بغیر کسی بھی شئ کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ ممکن نہیں۔ اس سے برہان اور اس اندازِ استدلال میں امتیاز و فرق کے حدود واضح ہوتے ہیں جس کو غلطی سے جاہل برہان سمجھ لیتا ہے۔ اس علم کی منفعت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب اس سے تمیزِ حقائق کا کام لیا جاتا ہے۔

علومِ اوائل میں ایک علم العدد ہے۔ اس کی تفصیلات سے متعلق اندرو ماخش مؤلف کتاب الارثماطیقی اور اس انداز کے دوسرے لوگوں نے گفتگو کی ہے۔ یہ بھی عمدہ اور صحیح تر علم ہے، جس کی بنیاد برہان ودلیل پر ہے۔ مگر اس کی منفعت دنیا ہی تک کے لیے ہے۔ مثلاً یہ کہ مال کی تقسیم کیونکر کی جائے وغیرہ، اور جس علم کی منفعت دنیا ہی تک محدود ہو، یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی یہ منفعت بہت کم ہے اور ناقابلِ اعتنا ہے۔ اس لیے کہ ہمیں اس دنیا سے جلدی ہی کوچ کرنا ہے، رہنا نہیں، اور جس کے مقدر میں القضا یا ختم ہو جانا ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ یحییٰ کہتے ہیں:

وماھذہ الدنیا سوی کر لحظۃ نعلم بھا الماضی ولم یحن بعد

یہ دنیا اس کے سوا کیا ہے کہ ایک لحظہ تھا جو گزر گیا، جس کے ذریعے تم ماضی کا اندازہ کرتے ہو اور پھر یہ لوٹنے والا نہیں۔

ھی الزمن الموجود لا شئ غیرہ ومامر والاتی عدیمان یا دعد

اسے بس زمانہ حال ہی سے تعبیر کرنا چاہیے، کیونکہ گزشتہ و آئندہ دونوں اے وعد معدوم ہیں۔

انہی علوم میں ایک مساحت بھی ہے جس پر کتاب اقلیدس کے جامع اور علم الہندسہ کے دوسرے ماہرین نے بحث و نظر کا ثبوت دیا ہے۔ یہ علم بھی عمدہ ہے، دلیل و برہان پر مبنی ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ خطوط و اشکال میں باہم نسبت کا تعین کیا ہے۔ اس کی معرفت اور پہچان سے دو کام لیے جاتے ہیں۔ افلاک و زمین کی ہیئت کا اندازہ اور رفع اشکال و تعمیرات یا زمین کی تقسیم وغیرہ۔ اس کا فائدہ بھی بس دنیا ہی تک کے لیے ہے اور ہم کہہ چکے ہیں کہ ایسی چیز کا فائدہ جو دنیا ہی تک محدود ہو بہت ہی کم درجے کا ہے، کیونکہ ایسے فوائد سے جلد ہی دست کش ہونا پڑتا ہے اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان اس دنیا میں عمر بھر رہتا ہے اور ان علوم سے بیگانگی کے باوجود کبھی بھی ضرر و محرومی کی اہمیتوں کو محسوس نہیں کرتا، نہ اس دنیا کے بارے میں اور نہ عقبیٰ کے بارے میں۔

اور انہی میں ایک علم الہیئت ہے۔ اس کی تفصیلات کو بطلیموس اور اس سے پہلے لوخس[1] نے بحث و نظر کا ہدف ٹھہرایا ہے۔ یا اہل ہند، قبسط اور قبطیوں میں سے ان لوگوں نے کچھ کوشش کی ہے جنھوں نے ان دونوں کا یا صرف بطلیموس کا تتبع کیا ہے۔ یہ بھی برہانی و حسی علم ہے جو عمدہ اور بہتر ہے۔ اس کا

---

[1] اس نام کا کوئی آدمی نہیں۔ ممکن ہے اس سے مراد ابرخس ہو جو بطلیموس کا استاد ہے۔

موضوع افلاک اور ان کے مدار معلوم کرنا ہے اور یہ جاننا ہے کہ ان کے مرکز، نقاطِ انقطاع اور بُعد کی کیا کیفیت ہے۔ اسی طرح کواکب، ان کی چال ڈھال، حجم اور بُعد یا تدابیر دریافت کرنا بھی اس کے موضوع میں داخل ہے۔ اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے احکام صنعت معلوم ہوتے ہیں اور حکمتِ صانع کی عظمتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کی قدرت، قصد اور اختیار کا پتا چلتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ بہت بڑا فائدہ ہے خصوصاً دنیا کے بارے میں۔

رہا نجوم و کواکب سے قسمتوں کا فیصلہ معلوم کرنا تو یہ قطعی باطل ہے۔ یہ صرف دعویٰ ہی دعویٰ ہے جس کی تائید میں کوئی دلیل پائی نہیں جاتی۔ ہم نے کتنی مرتبہ ان لوگوں کی قطعی پیش گوئیوں کو جھوٹا پایا ہے اس کی کوئی حد ہے نہ حساب۔ تم اگر اس حقیقت کو جاننا چاہتے ہو تو خود آزما کے دیکھ لو۔ تمھیں جھاڑ پھونک کرنے والے اور فال رمل بتانے والوں کی طرح ان کے جھوٹ کا کہیں زیادہ اندازہ ہوگا۔

علم الاوائل کی فہرست میں طب بھی ہے۔ بقراط، جالینوس، زیاسقوریدس یا جن لوگوں نے ان کے انداز کو اختیار کیا ہے، اس موضوع پر طبع آزمائی کی ہے، اس کا مقصد جب تک انسان اس دنیا میں ہے، امراض جسمانی کا علاج ہے۔ بلاشبہ یہ علم بھی خوب ہے اور دلیل و برہان پر مبنی ہے لیکن اس کے فوائد کا دائرہ بھی دنیوی زندگی تک ہی محدود ہے۔ علاوہ ازیں یہ فن عام نہیں۔ ہم نے اکثر بادیہ نشینوں اور ملکوں کو دیکھا ہے کہ جہاں بغیر کسی طبیب کی منت پذیری کے لوگ امراض سے چھٹکارا حاصل کر لیتے ہیں اور اسی طرح تندرست اور بھلے چنگے ہو جاتے ہیں جس طرح کہ علاج و دوا کے عادی لوگ ـــ یہی نہیں یہ کم و بیش اتنی ہی عمر پاتے ہیں جتنی عمر علاج و دوا کو آزمانے والے لوگ پا سکتے ہیں۔ ان میں سبھی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ محنت اور کام کاج کرنے والے بھی اور طبقۂ امرا میں ایسی عورتیں اور مرد بھی ہیں جو سرے سے کام کاج سے آشنا ہی نہیں ہوتے۔ ممکن ہے اس پر تم یہ اعتراض کرو کہ باقاعدہ علاج نہ سہی تاہم علاج کی کچھ صورتیں تو خود ان میں بھی مروّج ہیں جن سے یہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، مگر علاج کی یہ صورتیں قوانینِ طب سے میل نہیں کھاتیں۔ بلکہ طب کی رو سے ان کو لائقِ مذمت ٹھہرانا چاہیے۔ مثلاً یہ زیادہ تر جھاڑ پھونک کے قائل ہیں۔ ظاہر ہے کہ طب کو اس نوع کی چارہ سازی سے کوئی سروکار نہیں۔

تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہر علم جس کا نفع کم ہو اور اس کمی کے ساتھ جو صرف دنیا ہی میں کام آنے والا

ہو، علاوہ ازیں جس کی حالت یہ ہو کہ انسان اس کو نہ جاننے پر بھی اس دنیا میں اچھی خاصی زندگی بسر کر سکے، اس کے حصول کے لیے عقل مند اپنے کو ہلکان نہیں کرتا۔ نہ اس کے پیچھے عمر عزیز کو فنا کرنا پسند کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ نہیں چاہتا کہ اپنی چند روزہ زندگی ایسی چیزوں میں کھپا دے جو غیر ضروری ہیں۔

ان علوم کے مقابلے میں نبوت نے جن اشیا کو پیش کیا ہے، ان کی جھلک زندگی کے تین پہلوؤں میں دیکھی جا سکتی ہے۔

۱۔ اخلاق نفسیہ کی اصلاح اور ان میں بہترین عادات کا امتزاج، جیسے عدل، سخاوت، عفاف، صدق، برمحل شجاعت، صبر، حلم، رحمت اور ان تمام برائیوں سے اجتناب جو ان اخلاقِ فاضلہ کی ضد ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ منفعت کی عظیم ترین صورت ہے، جس کو اس دنیا میں اپنائے بغیر چارہ نہیں۔ از روئے عقل اس بات میں کوئی شک نہیں کہ نفس کی پاکیزگی اور اس کے بگاڑ کی اصلاح جسم کے علاج اور اس کی اصلاح سے کہیں بہتر ہے۔ کیونکہ جسم کا علاج خود نفس و روح کی اصلاح کے تابع ہے، اس لیے کہ نفس و روح کے علاج کے معنی یہ ہیں کہ انسان یہ طے کر لے کہ اسے اپنے جسم کے معاملے میں کسی ایسی شے کو گوارا نہیں کرنا ہے جو اس کو مریض بنا دے اور اس کی تکلیفوں میں اس طرح اضافہ کر دے کہ جس کی وجہ سے یہ دوسری اہم مصالح کی انجام دہی سے قاصر رہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ جو نظامِ اخلاق جسم اور روح دونوں کی اصلاح کا کفیل ہو، وہ اس نظام سے کہیں بہتر اور کہیں زیادہ لائق توجہ ہے جس سے صرف جسم ہی کی اصلاح ہوتی ہو۔ نبوت کے حق میں یہ دلیل عقلی بھی ہے اور ضروری اور حسی بھی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نبوت کے بغیر صرف فلسفے سے اخلاقِ نفس کی اصلاح ناممکن ہے۔ کیونکہ غیر اللہ کی اطاعت پر کوئی بھی فلسفہ انسان کو مجبور نہیں کر سکتا اور پھر ابھی عقل میں خود اختلاف دونما ہے کہ اخلاق کی کون صورت صحیح ہے اور کون صحیح نہیں۔ جس شخص میں قوتِ غضبیہ کا غلبہ ہے وہ اس شخص سے اخلاق و عادات میں مختلف ہوگا جس میں قوت نباتیہ کی فراوانی ہے، اور یہ دونوں عادات و اخلاق میں اس شخص سے جداگانہ کردار کے حامل ہوں گے، جس میں قوت ناطقہ کا عنصر غالب ہے۔

۲۔ منافع نبوت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ان لوگوں کے ظلم و تعدی کو روک دینا ممکن ہے جن پر وعظ و نصیحت کا اثر نہیں ہوتا اور جو از خود حقائق تک پہنچنے میں عجلت کا ثبوت بہم نہیں پہنچاتے یعنی نبوت سے ایسی فضا پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے جس سے دنیا جسمانی زندگی، عزت و ناموس اور مال و دولت

ایسی سبھی چیزیں محفوظ ہو جاتی ہیں اور غلبہ اور تعدی کے مقابلے میں امن و امان حاصل ہو جاتا ہے اور ایسے شخص کے نقصانات کی تلافی کا سامان مہیا ہو جاتا ہے کہ اگر وہ خود چاہے تو اس کا اہتمام نہ کر سکے۔ منافع نبوت کا یہ پہلو بلاشبہ عظیم اور جلیل القدر ہے۔ کوئی شخص بھی اس کے بغیر نہ اس دنیا میں زندہ رہ سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر کسی اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کو نظر انداز کر دینے کے معنی ہلاکت اور بربادی کے ہیں۔ یہ ایسے فوائد ہیں جن سے وہ علوم تہی ہیں جن کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ ظلم و تعدی کی روک تھام اور باہمی لطف و تودد کی فضا کا تصور نبوت کے بغیر ممکن نہیں۔ کیونکہ جہاں تک غیر اللہ کی اطاعت کا تعلق ہے کسی بھی دلیل و برہان کی رو سے اسے تسلیم نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ حق اور خواہشات کی بوقلمونی کسی بھی عقلی اصول کی فرماں روائی ماننے پر آمادہ نہیں۔

۳۔ تیسرا پہلو جسے نبوت کے فوائد میں شمار کرنا چاہیے یہ ہے کہ یہ اس دنیا سے کوچ کے بعد روح کو ہلاکت سے نجات دلاتی ہے، اور یہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ کوئی بھی چھوٹی بڑی خوبی اس کا مقابلہ نہیں کر پاتی۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا کو کیوں پیدا کیا اور ہم کیونکر نجات سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں؟ اس کو صرف نبوت ہی کے ذریعے جاننا ممکن ہے۔ فلسفیانہ علوم کے بس کا یہ روگ نہیں اور جو شخص اس کو جاننے کا دعویٰ کرتا ہے وہ جھوٹا ہے۔ کیونکہ اس کی تائید میں دلیل و برہان پیش کرنا ناممکن ہے۔ لہٰذا یہ دعویٰ باطل ٹھہرے گا۔ اگرچہ یہ عین ممکن ہے کہ کوئی اس نوع کا دعویٰ کرے، لیکن دعویٰ کسی کا بھی ہو، جب دلیل و برہان کے بغیر پیش کیا جائے گا تو ناقابلِ تسلیم ہوگا۔ لطف یہ ہے کہ خود دلیل و برہان کا تقاضا اس انداز کے دعاوی کو جھٹلاتا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ تمام فلاسفہ جن کو اس سلسلے میں سند سمجھا جاتا ہے خود باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ اس صورت میں یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ حقیقت کی طلب و جستجو کے سلسلے میں ان حضرات کے دروازوں پر دستک دی جائے جن کے بارے میں دلیل و برہان سے ثابت ہو کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں خالقِ عالم اور مدبرِ عالم کی جانب سے کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جو ہر اس شخص کو مجبور کرتا ہے جو اپنے نفس کے حق میں عقل و اخلاص کا مدعی ہے کہ وہ اپنی تگ و دو اور کوشش کو صرف اسی حقیقت کے جاننے پر مرکوز کر دے، ورنہ وہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے والا ہے۔ اسے چاہیے کہ علومِ نبوت کو چھوڑ کر ایسے علوم میں مشغول نہ ہو جن کا فائدہ نسبتاً کم ہے، اور اگر کوئی اس کم منفعت کے سودے کو اختیار کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ کوتاہ

اندیش ہے اور اس کی قوت تمیز فاسد ہے اور اس کی پسند صحیح نہیں۔ یہی نہیں یہ قابل مذمت ہے، اس نے اپنی جان پر عظیم ظلم ڈھایا ہے۔

فکر و نظر کی پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اس حقیقت پر غور کرے کہ کیا یہ عالم حادث ہے۔ جیسا کہ انبیا کا دعویٰ ہے یا قدما اور فلاسفہ کی اکثریت کہتی ہے۔ یا ازلیت کا حامل ہے، جیسا کہ ان کے علاوہ کچھ اور لوگوں کا عقیدہ ہے۔ عالم کا حادث ہونا ایسا مسئلہ ہے جو حسی و ضروری دلیل پر مبنی ہے۔ مشاہدہ بتلاتا ہے کہ حیوانات اور نباتات کی تمام تر قسمیں جن کا تعلق نمو و بالیدگی سے ہے، متناہی اور محدود ہیں اور یہ کہ ان میں کی بعض اقوام کے افراد دوسری اقوام کی نسبت سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ جب اس حقیقت میں کوئی شبہ نہ رہا تو یہ بات آپ سے آپ ثابت ہو جاتی ہے کہ ہر تعداد جو متناہی ہو اس کے لیے ایک مبداء آغاز کا ہونا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر فلک کلی کو لو، اس کی ہر ہر حرکت سے زمان دو وقت کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے جو اس حرکت سے پہلے موجود نہیں ہوتا۔ چنانچہ ہر شخص اس حقیقت سے آشنا ہے کہ جس چیز میں اضافہ ہوتا ہے، وہ پہلے ناقص ہوتی ہے اور پھر اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہذا فلک کلی نقص و اضافہ کا ہدف ٹھہرا، اور ظاہر ہے کہ ان دونوں کا وجود اس شی میں ہوگا جو مبدا و انتہا سے آشنا ہو، اور یہ اگر صحیح ہے تو ضرور اس عالم کا بھی مبدا ہوا، جس کو مبدا محدث کہنا چاہیے۔ واللہ اعلم۔

نیز زمانہ تمام تر اسی حقیقت کا نام تو ہے کہ ایک دن (یوم) ہے اور اس کے بعد پھر ایک دن ہے اور اسی تسلسل ایام سے اس کے وجود کا تانا بانا تیار ہوتا ہے اور یہ حقیقت بھی مشاہدہ میں آتی ہے کہ یہ ایک ایک دن ایسا ہے کہ جس کے لیے مبدا و انتہا ہے، جس کے یہ معنی ہیں کہ زمانے کا ہر ہر جزء، مبدا و انتہا سے متصف ہے اور زمانہ اپنے ان اجزا سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتا، اس لیے نفس زمانے کے لیے بھی منطقی ضرورت کی بنا پر مبدا و انتہا کو ماننا پڑے گا۔

جو شخص زمانے کو اس کے سوا محض ایک مدت تصور کرتا ہے، وہ ایسے باطل کا دعوے دار ہے، جس کی تائید میں کبھی بھی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح جو شخص زمانے کو باری تعالیٰ پر منطبق کرنے کی کوشش کرتا ہے وہ ناحق تناقص کا شکار ہوتا ہے، کیونکہ زمانہ جس طرح کہ ہم ثابت کر چکے ہیں، مبدا سے متصف ہے اور باری تعالیٰ کے لیے مبدا و آغاز کا تصور سرے سے باطل ہے، کیونکہ وہ تو خالق زمان ہے، لہذا ضروری ہے کہ اس کا وجود غیر زمانی ہو۔

فکر و نظر کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس عالم کو کوئی معرض وجود میں لانے والا ہے یا نہیں۔ عقل کا اوّلین فیصلہ یہ ہے کہ حادث پذیر ہونا اور آغاز و ابتدا سے آشنا ہونا ایک فعل ہے، اور فعل منطقی طور سے فاعل چاہتا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ نیز یہ حقیقت بھی غور طلب ہے کہ جہاں تک اس عالم کی ترقی و تربیت کا تعلق ہے اور اس کی آبادی، زراعت اور حیوانات کو سدھانے وغیرہ کا سوال ہے یہ تمام مسائل ایسے ہیں جو ایک زبان اور لغت کے مقتضی ہیں کہ جس کے ذریعے بات چیت کی جا سکے، اور مخاطب کو اپنا مافی الضمیر سمجھایا جا سکے۔ ہمارا یہ مشاہدہ ہے کہ جو شخص لغت و زبان سے واقف نہیں ہوتا وہ بات چیت پر بھی قادر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اگر ایک شخص پیدائشی بہرا ہو تو اس سے ہرگز توقع نہیں کی جا سکتی کہ کبھی وہ بول سکے گا۔ اس سے ثابت ہوا کہ آدمی اسی وقت گفتگو کر سکتا ہے جب وہ گفتگو سن سکے اور اس کے مفہوم سے آگاہ ہو سکے۔ یہی حال تمام علوم کا ہے۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک ان میں حسن و کمال پیدا نہیں کر سکتا۔ جب تک کہ ان سے اچھی طرح باخبر نہ ہو۔ اس دعوے کی دلیل تاریخ عالم کے مشاہدے پر مبنی ہے۔ جو شخص زبان و کلام کے تیوروں کو نہیں جانتا وہ علوم و فنون تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، اور وہ قومیں جن میں غیر ترقی زبان ہونے کی وجہ سے علم کا کوئی تصور نہیں، ان میں علوم فنون کے پنپنے اور ترقی کے امکانات کا بھی فقدان ہے۔ چنانچہ بلادِ روم، صغانیہ، ترک، دیلم، سبودان، بربر اور صحراؤں میں رہنے والے، جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے، برابر علوم و فنون سے محروم چلے آ رہے ہیں چنانچہ نہ تو ان میں آلاتِ زراعت کا وجود ہے اور نہ کپڑا بننے اور تیار کرنے کا کوئی سلیقہ ہے، اس لیے کہ یہ ساری چیزیں اس وقت معلوم ہوتی ہیں جب کوئی بتانے والا ہو۔ اس پر دلیل یہ ہے کہ جو سرے سے جانتا ہی نہیں، وہ علم میں کیا ترقی کرے گا۔ چنانچہ جو ملک ان علوم و فنون سے شروع ہی سے محروم رہے وہ آج تک اس محرومی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے۔

ان کے سوا کچھ ایسی چیزیں بھی ہیں جو تعلیم و تعلم کے بغیر حاصل ہوتی ہیں، جیسے دودھ پینا، اکل و شرب اور جنسی تقاضوں کو پورا کرنا وغیرہ۔ ان چیزوں میں انسان یا حیوانات کو کسی معلّم کی ضرورت نہیں پڑتی لیکن جہاں تک زبان اور فنون کا تعلق ہے اس کے لیے لازماً معلّم اور استاد کی ضرورت پیش آتی ہے، ایسے استاد و معلّم کی نہیں کہ جن کی طبیعت میں پہلے سے از خود بتقاضائے فطرت بعض چیزوں کا علم رکھ دیا گیا ہے کیونکہ فنون اور صناعات کا علم اگر ایسے ہی طبعی تقاضے کا مرہون منت ہوتا تو یہ فنون ہر ہر دور میں اور ہر

جگہ یکساں حیثیت سے پائے جاتے۔ اس لیے کہ فطرت بہرحال ایک ہے۔ اگر فنون وصناعات کا عا
فطرت کی فیض بخشیوں کا نتیجہ ہوتا تو ہم تمام قوموں کو بغیر کسی امتیاز کے بہرہ مند پاتے، اِلّا یہ کہ کسی
کی وجہ سے کوئی قوم اس سے استفادہ نہ کر پاتی۔

اور اگر یہ تجزیہ صحیح ہے تو منطقی ضرورت اس بات کی مقتضی ہے کہ جس ذات نے اس عالم کو
بخشا ہے، وہی علوم اور فنون کو پیدا کرنے والی ہو۔ چنانچہ اسی ذاتِ گرامی نے یہ زبان اور
اس انسان کو سکھائے جس کو اس نے سب سے پہلے پیدا کیا اور پھر اس معلّم نے ان کو تمام بنی نو
تک وسعت دی۔

دلیل کی یہ نوعیت ضروری اور حسّی ہے، جو ایک طرف تو وجودِ خالق چاہتی ہے اور دوسر
وجودِ نبوت کی مقتضی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ خالقِ عالم ہی نے علوم وفنون کی ابتدأً تعلیم دی او
رسالت کا بھی پتا چلتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ پھر اس نبی نے ان علوم وفنون کو ان لوگوں
پہنچایا کہ جن تک پہنچانے کے یہ مکلّف تھے۔

جب ان سب مقدمات کی صحت ثابت ہو چکی تو اب یہ دیکھنا چاہیے کہ اس عالم کو وجود میں لا
واحد ہے، یا کثرت کا حامل ہے۔ اس سوال کا جواب عقل کے بہت ہی قریب تر ہے۔ اس کی تفصیل
کہ اگر واحد نہ ہو تو پھر نہ عدد کا کوئی تصور باقی رہتا ہے اور نہ معدودہ کا۔ مگر یہ واحد ہے کہاں؟
اس نقطۂ نظر سے پورے عالم کا جائزہ لیا۔ لیکن ہم نے اس میں "مجرد واحد" نہ پایا۔ اس لیے کہ
عالم کی ہر ہر شی تقسیم پذیر ہے اور جب تقسیم پذیر ہے تو کثرت کی حامل ہوئی۔ مگر واحد کا ہونا بہر
ہے اور جب یہ عالم کثرت کا آئینہ دار ہے تو ظاہر ہے کہ یہ "واحد" اس عالم کا حصہ نہیں ہو سکا
کے لیے ضروری ہے کہ "غیر عالم" ہو۔ یعنی عالم سے الگ اور علیحدہ ایک ذات ہو، اور یہ علیحدہ
الگ ذات وہی ہے جس نے اس عالم کو وجود کے قالب میں ڈھالا جس میں نہ کثرت ہے اور نہ تعدد، اا
سوا اور کوئی بھی "واحد" نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اسی واحد نے اس عالم کو بنایا۔ چنانچہ یہ عالم مح
ہے اور بعد میں سطحِ وجود پر ابھرنے والا ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں، پہلے یہ وجود سے یکسر عاری
پھر اس مکوّن نے اس کی تخلیق کی اور وجود عطا کیا۔ یہ اگر درست ہے تو واحد کے ساتھ ساتھ یہ بھی
ہے کہ یہ واحد" اوّل ۔۔۔ کیونکہ اگر اوّل ۔۔۔ ہو تو یہ ثانی یعنی بعد میں منصۂ شہود پر آنے والا

ہو میں قطعی موجود نہ ہو۔ لہٰذا اگر ثانی موجود ہے تو منطقی ضرورت کا تقاضا ہے کہ اول بھی موجود ہو اور ثانی موجود ہے، اس لیے اول بھی موجود ہے۔ مگر یہ اول ہے کہاں؟ ہم نے اس سوال کا جواب ں کرنے کی غرض سے اس عالم کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ہمیں کہیں بھی ایسا اول نہ مل سکا جو ازلی ہو۔ جو ا حادث ملا، جو پہلے کتمِ عدم میں تھا اور پھر اس کو اس پیدا کرنے والے نے سطحِ وجود پر اُبھارا۔ لہٰذا اس ں" کو منطقی ضرورت کی بنا پر غیرِ عالم، یعنی اس عالم سے الگ تھلگ ہونا چاہیے اور اسا الگ تھلگ ذات وہی ں نے پہلے پہل اس عالم کو پیدا کیا۔

اب جب کہ وجودِ خالق ثابت ہو گیا اور یہ بات ثابت ہو گئی کہ وہ ایسا واحد ہے جو اول ازلی ہے اور ور رسالت کی تصدیق ہو گئی تو ضروری ٹھہرا کہ انبیا کی تعلیمات پر غور کیا جائے۔

جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے، ہم نے دو وجہ سے اسے حد درجہ فاسد پایا۔ ایک تو اس بنا پر کہ نے توحید کو باپ، بیٹا اور روح القدس میں منحصر جانا۔ دوسرے اس بنا پر کہ ان کے ہاں نقل و ن کا سلسلہ ناقص ہے۔ مثلاً اناجیل کو صرف تین ہی آدمی روایت کرتے ہیں۔ مرقس، لوقا اور ، جو محض ناقل ہے، اصل الفاظ متی کے ہیں۔ اس طریقِ روایت سے ان کا جھوٹ نکھر کر سامنے آجاتا علاوہ ازیں ان میں تضاد بھی رونما ہے جو کھلے ہوئے کذب پر دلالت کناں ہے۔ لہٰذا ان کا طریق ن مستند نہ رہا۔ علاوہ ازیں اس شریعت کی ساخت میں ان کے دینی علما اور پادشاہوں کا بھی ہاتھ ہے انھوں نے خود اقرار بھی کیا ہے۔ جب روایت کا یہ انداز ہو تو اس سے استدلال کرنا جائز نہیں ہوتا کیونکہ روایت کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ یہ براہِ راست پیغمبر سے مروی ہو۔

یہودیوں کی شریعت کو بھی ہم نے حد درجہ بگڑا ہوا پایا، اس لیے کہ یہ جن کتابوں سے ماخوذ ہے، وہ اول ے غائب ہیں۔ ان کو ابتدا سے لے کر دورانِ اشاعت تک اتنے لوگوں نے روایت نہیں کیا کہ بارے میں غلطی اور کذب کا امکان نہ اُبھر سکے۔ اس میں تغیر و تبدل بھی ہوا ہے، اس کے کچھ حصے ی ہوئے ہیں اور پھر ایسے مرحلے بھی آئے ہیں، جب کہ سرے سے اس پر عمل ہی نہیں ہوا اور اس کی روایت کا اہتمام ہی نہیں ہو سکا۔ وہ یہ دور ہے جب ان کو اقتدار حاصل ہوا اور انھوں نے اسے ماننے کار کیا۔ اس کے بعد جا کر کہیں انھوں نے اس کو دوبارہ مرتب کیا۔ یہ بھی سیکڑوں برس سے ان میں روایت کی صورت میں موجود ہے۔ لیکن اس میں اخبار و احوال سے متعلق خاصا جھوٹ پایا جاتا ہے۔

مزید برآں باوجود زبانی اقرار کے یہودیوں نے عملاً کبھی اس کو قائم کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اور ظاہر ہے جس شریعت کے بارے غفلت و انکار کا یہ عالم ہو وہ من جانب اللہ نہیں ہو سکتی۔ اس کا باطل اور غلط ہونا ضروری ہے، اس لیے کہ اس کے بتائے ہوئے فرائض و واجبات پر عمل پیرا ہونے کی کوئی صورت پیدا ہی نہیں ہوئی۔

یہودیوں کے بعد ہم نے مجوسیت پر غور کیا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ یہ لوگ کھلے بندوں اس بات کے معترف ہیں کہ ان کی شریعت کے کثیر حصے کو اردشیر بن بابک نے ترتیب دیا ہے اور قریب قریب دو تہائی حصہ اس کا اس وقت ضائع ہو گیا جب سکندر نے ان کی کتاب کو نذر آتش کیا۔ جس کتاب کی عدم حفاظت کا یہ حال ہو، اس پر دین کی بنیاد رکھنا کب جائز ہے۔ اس لیے کہ جس کو وہ دین قرار دیتے ہیں، اس کے متعلق ان کی یہ متفقہ رائے ہے کہ اس کا اکثر حصہ ضائع ہو چکا۔ ان حالات میں کوئی بھی عقل مند اس کو شریعت قرار نہیں دے سکتا۔

پھر ہم مانی کے ماننے والوں کو فکر و نظر کا ہدف ٹھہرایا۔ ہم نے دیکھا کہ یہاں بھی نقل و روایت کا سلسلہ فاسد ہے۔ ان میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں ملتا جس نے براہ راست مانی سے دین کی روایت کی ہو۔ پھر مانی کی طرف جو خبریں منسوب ہیں ان میں کھلی ہوئی تحریف بھی پائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں معجزے کی قبیل کی کوئی شی بھی ان روایات میں منقول نہیں کہ جس سے صحتِ نقل کا ثبوت فراہم کیا جا سکے، جس تعلیم کا یہ حال ہو، اس کے باطل ہونے میں کیا شک ہے۔ اس میں فساد اور بگاڑ کا واضح ثبوت یہ بھی ہے کہ اس میں اس بنا پر قطع نسل کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ نور ظلمت کے چنگل سے مخلصی حاصل کر سکے۔ قطع نسل کی یہ تدبیر قطعی ناکام اور ناقص ہے۔ اس لیے کہ ظلمت تنہا انسانی قالب میں نہیں، اس کے حامل بے شمار حیوانات ہیں جو بحری بھی ہیں اور بری بھی، اڑنے والے بھی ہیں اور زمین پر چلنے والے بھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب اپنی نسل ختم نہیں کر سکتے۔ اور پھر جس شریعت کا مدار قطع نسل پر ہو کیا اس سے بڑھ کر کوئی شریعت فاسد ہو سکتی ہے؟

یہ حقائق اگر درست ہیں تو ایک عاقل کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ عمر بھر اسی شریعت کی طلب و جستجو اور معرفت میں لگا رہے۔ جس کی وجہ سے اسے معاد میں سرخرو ہونا ہے، اور سدا ہلاکت سے بچنا اور جہنم کی آگ سے مخلصی حاصل کرنا ہے۔ یہی نہیں جس کی بدولت اسے آسمان کی ان بلندیوں تک رسائی حاصل کرنا ہے جو حیات ابدی کا مرکز ہیں، جو ہر طرح کے تکدر سے پاک ہیں، سرور و انبساط کے ابدی ٹھکانے ہیں، یعنی

جہاں ایسی لذتوں کا سامنا ہے کہ جو زائل اور منقطع ہونے والی نہیں۔ ہر سمجھ دار انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ دیگر علوم سے صرف اسی حد تک تعرض کرے کہ جس حد تک وہ ان کی غرض و غایت جان سکے اور جہل و نادانی کے عیب کو دور کر سکے اور اس غلط فہمی سے اپنا دامن بچا سکے کہ شاید ان علوم میں ایسے حقائق پائے جاتے ہیں جو علوم دین میں پائے نہیں جاتے۔ ہو سکتا ہے ان علوم میں ایسی باتیں بھی ہوں جن سے دینی حقائق کی تائید ہو سکے، جب وہ ان علوم سے بقدر ضرورت بہرہ ور ہو جائے تو پھر اسے ان علوم کی طرف عنانِ توجہ کو موڑنا چاہیے، جن میں اس کی نجات مضمر ہے۔

اب جہاں تک فلاسفہ کا تعلق ہے، انھوں نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ انھوں نے ان علوم کی بدولت آخرت میں نجات حاصل کر لی ہے، اور اگر وہ ایسا دعویٰ کریں جب بھی اپنے اس دعوے میں اس بنا پر جھوٹے سمجھے جائیں گے کہ ان کے پاس کوئی دلیل ایسی پائی نہیں جاتی جس سے ابدیت کی تصدیق ہو سکے، جس سے ہر طرح کے تکدر سے مخلصی حاصل کر لینے کی تدبیر کی طرف اشارہ پایا جائے، یا جس سے سرور و لذت ابدی کا سراغ مل سکے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

پھر جہاں تک ان کے نظریات کا تعلق ہے، ان کی اپنی کتابوں کے مطابق ان میں شدید اختلاف رونما ہے۔ بعض حدوثِ عالم کو ثابت کرتے ہیں، جیسے سقراط اور افلاطون ہیں۔ بعض کی یہ رائے ہے کہ یہ عالم تخلیق و آفرینشِ ازل سے اسی نہج پر چل رہا ہے اور اس کا خالق و فاعل بھی اسی نسبت سے ازلی ہے۔ اس رائے کو لوگ ارسطو کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ ثبوت، آخرت اور آخرت میں سزا و جزا یا فرشتے، ان سب کا ثبوت ملتا ہے۔ افلاطون اور کلیلہ دمنہ کے ہندوستانی حکما کا یہی خیال ہے۔ ان میں کے بعض تناسخِ ارواح کے بھی قائل ہیں جیسے سندباد کے قصے سے بھی عیاں ہے۔ غرض ان میں اسی طرح کا اختلاف رائے ہے، جس طرح کہ دوسروں میں ہے۔ شمہ بھر فرق یا امتیاز اس میں پایا نہیں جاتا۔

اس بنا پر عقل مند اور خود اپنے حق میں خیر خواہ اسی شخص کو سمجھا جائے گا جو اطاعت و پیروی کے لیے ایسی شخصیت کو چنے جو اسے نجات کے راستے پر ڈال دے اور اس شخص کو مجنون خیال کیا جائے گا جو ایسے شخص کی ارادت کا جوا اپنی گردن میں ڈالے جو نہ تو اسے نجات سے ہم کنار کر سکتا ہے اور نہ دنیا و عقبیٰ میں کوئی فائدہ ہی پہنچا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے۔

ا یہ مقدمات صحیح ہیں تو یہ وصف صرف ہمارے ہادی ہی میں پایا جاتا ہے جس کو ہمارے خالق نے
طرف مبعوث فرمایا ہے کہ وہ دنیا و عقبیٰ میں ہمارے لیے نجات و مخلصی کا سبب قرار پائے۔ اس
ت سے آگاہ رہنا بھی ضروری ہے کہ جس شخص نے علم شریعت اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس
اسی تفوق حاصل کرے یا مال و دولت کو اپنے دامنِ طلب میں سمیٹے، اس کے بارے میں سمجھ لیجیے کہ اس
ت مول لی۔ اس لیے کہ اس نے ایسی چیز چاہی جس کی طلب و جستجو کے لیے اس کے خالق نے اسے پیدا
یا۔ ہمیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ملا ہے، وہ صرف یہ ہے کہ ہم ایسی شریعت کے حصول کو اپنا
العین ٹھہرائیں جس کے ذریعے دنیا و آخرت میں ہم نجات سے بہرہ مند ہو سکیں اور اللہ کے عذاب
وظ رہ سکیں۔ لہٰذا جس نے اپنی طلب و جستجو کا محور کسی ایسی چیز کو بنایا، جس کا حکم اللہ تعالیٰ نے
یا، اس نے اس کی عطا و بخشش سے محرومی حاصل کی، اس کی محنت رائیگاں گئی، عمل باطل
رسعی و کوشش نے غلط راستہ اختیار کیا۔

سی طرح اس حقیقت کو بھی جان لینا ضروری ہے کہ جس شخص نے شریعت کو ایسے شخص کے ذریعے حاصل
سعی کی، جس کی روایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی یا جس نے ایسے شخص کی پیروی
ی پیروی کا اللہ تعالیٰ نے اس کو مکلف نہیں ٹھہرایا، اس نے بھی خسارے کا سودا کیا اور اپنے اعمال
کیا۔

ہم نے جو باتیں بیان کی ہیں یہ بعینہٖ ان اہلِ حق حضرات کا وتیرہ رہا ہے کہ جنھوں نے آنحضرت
ں صحبت سے استفادہ کیا، اور دین کی تعبیر کا وہی انداز ان کے بعد تابعین اور تبع تابعین نے
یا۔ اس زمانے میں کچھ ایسی فاسد اور غیر صحیح آرا کا بھی اظہار ہوا، جن کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ
ازو رواج کب ہوا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ وہ تمام افکار جو آنحضرتؐ کے پیغام اور
سے متصادم ہیں، باطل ہیں، اور باطل سے دامن کشاں ہی رہنا چاہیے۔ یہ ہے تمھارے سوال
، جو اگرچہ بدرجہ غایت مختصر ہے، تاہم اس میں بیان اور دلائل کی کمی نہیں۔ وباللہ التوفیق۔